اردو ناول میں تصور وقت

The novel by its very nature encompasses the whole of life: the consciousness of an age, the styles of the living and the variety of existence at many levels and in many eras of the past. Every thing is grist to the mill. Time therefore has a dostomct and vital role to play in a genre which sometimes is defined as social reportage. In a work of fiction it works like a question mark. It has always been a challenge to the writer. The article here makes an attempt at how various writers have managed to apprehend it in their work.

ناول ایک ایسی تحریر کا نام ہے جو شعور زیست کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف چلن اور زندگی کے قرینے سامنے لاتی ہے۔ اسے لانگ فکشن بھی کہا جاتا ہے جس نے نثر کی دوسری اصناف، قصے اور داستان کی جگہ لے لی ہے۔ ناول میں کردار نگاری کے ذریعے انسانی سائیکی اور مختلف وقوعوں کے ذریعے زندگی کے بدلتے ہوئے منظر پیش کیے جاتے ہیں۔ دوسری اصناف ادب کی طرح ناول بھی لامتناہی انسانی تجربات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔

ناول کے ڈھانچے میں تین بنیادی عناصر کو اہمیت حاصل ہے۔ اول Pattern

Scanned by CamScanner

نئے معنی کی فارم کی تلاش کیا جاتا ہے ... اور نیا انداز نظر۔ ان تمام عناصر میں
زندگی کے ظاہری اور مخفی پہلوؤں کو کہانی کے دائرے میں پورا پیش کرنے کے حوالے سے
سماجیات کے ماہر لیوی سٹراس Claude L. Strauss نے یہاں تک کہہ دیا کہ مستقبل
میں ابھرنے والے ناول کی شکل Myth یا اساطیر جیسی ہوگی۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ ہمارے
ہاں ناول کی یہ فارم، فارسی، عربی، سنسکرت اور اردو میں ایک مدت سے موجود ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ ناول کو ڈی ایچ لارنس نے کتابوں کی دنیا میں سے زیادہ اہم ایجاد قرار دیا ہے اور
ناول کی لامحدود وسعت کو دریافت کرتے ہوئے یہ کہہ کر ایک مضمون پیش کیا تھا کہ اس میں
سب کچھ سمویا جا سکتا ہے لیکن زندگی کی مختلف سطحوں کا ادراک ضروری ہے۔ یوں ناول
ایک ایسا طلسم ہے جس میں شاعری کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ میرے کہے کی تصدیق
جمیلہ ہاشمی کے ناول "دشت سوس" اور بورس پاسترناک کے ناول "ڈاکٹر ژواگو" سے کر
لیجیے۔ پھر یہ کہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے جین آسٹن کے ناولوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا
کہ ناول، چاول کے دانے پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن ہے۔ بے شک قرۃ العین حیدر جیسا
ناول نگار مشکل سے پیدا ہوتا ہے جو ایک طلسماتی جہان میں لے جانے کی سکت رکھتا ہو۔

بڑے ناول میں کئی علوم کی بازگشت بیک وقت سنائی دیتی ہے جیسے سائنس،
تاریخ، فلسفہ، علم البشریات، اقتصادیات، عمرانیات، الٰہیات، مذہبیات، تہذیبی مطالعے،
مصوری، سیاسیات اور Geneticongi کا علم ہے، نئے عہد کے حوالے سے ان دنوں
Genomics بھی کہا جا رہا ہے۔ یوں مختلف علوم و فنون سے استفادے کے سبب ناول
نگار انسانی نفسیات کے منظرنامے کو تبدیل کر رہا ہے۔ اردو کے پہلے ناول نگار عبدالحلیم شرر،
رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، اے حمید، قرۃ العین حیدر،
ممتاز مفتی، قاضی عبدالستار، عصمت چغتائی، محمد احسن فاروقی، خان فضل الرحمٰن، حیات اللہ
انصاری، فضل احمد کریم فضلی، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، عبداللہ حسین، شوکت صدیقی اور انور

Scanned by CamScanner

غالب کے ناولوں میں تاریخ اور وقت کا جبر، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، معاشی مسائل، وجودی مسائل، ہجرت، ناسٹلجیا، زندگی میں جاری و ساری Fantasies، مذہبی تفکر، روحانی کرب، ہمہ گیر مایوسی، یاسیت و قنوطیت، موت کی خواہش اور موت کا خوف، ٹوٹتے بنتے رشتے، غربت، مفلسی، استحصال، تنہائی، باطنی کرب، دہشت گردی، خودکشی کا رجحان، ہمہ گیر ناآسودگی اور بے شمار دوسرے خارجی و داخلی مسائل کہ جن کا حل انسانی دسترس میں بھی اور باہر بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ پھر اس طرح کے مسائل بھی کہ مادہ، روح پہ غالب آ گیا ہے جو انسان کو ناکارہ بنا رہا ہے اور منفی سوچوں کے ساتھ ساتھ ایسے اعمال کو جنم دے رہا ہے جو آدمی کے بجائے صرف جانوروں سے وابستہ ہیں۔ ناول کے اس منظر نامے کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر سلیم اختر نے آج سے بارہ سال پہلے یہ کہا تھا کہ:

> "ناول پر ایک ایسا وقت آیا تھا جب اس کی ترقی کی رفتار اتنی تیز نہ تھی جتنی کہ زندگی کی تھی لیکن اب سنبھلنے کا وقت آ چکا ہے۔ ہرڈل Hurdel Race ختم ہو رہی ہے اور اب ناول فنی بلندی چھونے کو ہے۔"(۱)

بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اس سے قبل کی کارکردگی کا جائزہ لینا اس لیے ضروری ہے کہ کام کا آغاز کہاں سے ہوا اور کہاں تک ہوا۔ اس حوالے سے کام کرنے والوں میں پہلا اہم نام قرۃ العین حیدر کا ہے بالخصوص "آگ کا دریا" کے حوالے قرۃ العین حیدر نہ صرف منفرد بلکہ منفرد بھی رہی ہیں۔ ان کا ناول "آگ کا دریا" ایک دلچسپ تکنیکی تجربہ ہے۔ خصوصاً Shifting Identities کی تدبیر اس ناول میں بڑی خوبی کے ساتھ برتی گئی ہے۔ اس میں وقت کی کارفرمائیاں، موت، ہجرت، انسانی مقدرات، جنگ، فاتح اور مفتوح اور مذہبی اثرات کے بارے میں ماجرے جس طرح منتقل ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمہ جہت بحثوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور ان کے اثرات دوسرے فنکاروں کے ناولوں پر

Scanned by CamScanner

فکر کے حوالے سے شعوری و لاشعوری انداز سے پڑے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' میں ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی نظم ''خرابہ'' کی طرح وقت کا ایک اہم حوالہ ہے۔''وقت'' ہر دور میں موضوع بحث رہا ہے۔ سینٹ آگسٹن کا یہ مشہور قول، جو ان کی کتاب ''اعترافات'' میں ملتا ہے، قابل ذکر ہے کہ ہم وقت کو برابر محسوس تو کرتے رہتے ہیں کہ اس میں ملفوف اور ملوث ہیں، لیکن اگر اس کی ماہیت بیان کرنا چاہیں تو اپنے آپ کو محض لاچار اور بے بس پاتے ہیں۔ وقت کو حقیقی تسلیم کرنے والے دو گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں اور نہ تقسیم کرنے والے ڈاکٹر اقبال اسے حقیقی ماننے والوں میں سے ایک ہیں۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں

> ''وقت کو بیان ان معنوں میں نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس کے تین بنیادی اجزائے ترکیبی یعنی ماضی، حال، مستقبل میں سے کوئی ایک بھی انسانی ادراک کی گرفت میں پوری طرح سے آجانے والا نہیں۔ ماضی کے لمحات جو گزر چکے ہیں، اب واپس نہیں لائے جا سکتے، مستقبل اپنے آپ کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت تو ضرور رکھتا ہے کہ وہ وقت کے درجہ پر ہے۔ لیکن بالآخر اس کی کیا صورت ہوگی، یہ کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی پیش بینی ممکن ہے حال جس سے ہمارا سروکار ہوتا ہے، یا تو پلک جھپکنے میں ماضی میں ضم چلا جاتا ہے یا پھر مستقبل کی طرف حریص نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔''(۲)

یوں، وقت (Time) انسان کے لیے ہمیشہ سے ایک معمہ رہا ہے اور تخلیق کاروں کے لیے ایک پراسرار قوت، یہاں تک کہ اوائل بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں آئن سٹائن نے تصور زمان و مکاں کے معمہ کا حل سائنسی بنیادوں پر اخذ کیا اور ڈاکٹر اقبال نے

Scanned by CamScanner

آئن سٹائن کے تصور وقت (Time and Space) کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ خاص طور پر "مسجد قرطبہ" کا آغاز اس حوالے سے اہم ہے۔ اردو شاعری میں اقبال کے بعد مجید امجد اور قرۃ العین حیدر نے وقت سے متعلق والہانہ شغف کا اظہار کیا۔ مجید امجد اور قرۃ العین حیدر کے نزدیک، وقت سب سے بڑی تخلیقی قوت ہے۔ جسے شناخت کرتے ہوئے وہ قدرے تیقن کا اظہار بھی کرتے ہیں

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول (مجید امجد)

اسی احساس وقت نے مجید امجد اور قرۃ العین حیدر کے ہاں احساس فنا کو ابھارا ہے۔ زمان و مکان کے حوالے سے ان تمام ناول نگاروں کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات بے جواب جنم لیتے ہیں اور انسانی علم کی بے بضاعتی کا انکشاف کرتے ہیں۔ مجید امجد اور قرۃ العین حیدر کے تصور وقت پر بات کرنے سے پہلے "وقت" کے اسرار کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ وقت قدیم ترین چیز ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے "زمانے کی قسم" کھائی ہے۔

"زمانے کو برا نہ کہو کیونکہ زمانہ میں خود ہوں"

وقت کو سائنسی اعتبار سے روکنا ممکن نہیں، وقت تھمتا نہیں ،بس گزرتا چلا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خواہ انسان ہوں یا انسان کی تعمیر کردہ عمارات اور ایجادات، انہیں مسلسل گزرتا ہوا وقت اس طرح نہیں رہنے دیتا جیسا کہ وہ ہوتی ہیں۔ مجید امجد اپنی نظم "درس ایام" میں لکھتے ہیں:

سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی
تخت و کلاہ قصر کے سب سلسلے گئے

Scanned by CamScanner

زمان و مکان ایک ایسا موضوع ہے جس پر فلاسفروں، شاعروں اور سائنسدانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر اپنے شاہکار افسانے "فوٹو گرافر" کے آخر میں لکھتی ہیں: "زندگی قصوں کو کھا گئی، صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔"

فرانسیسی شاعر بودلیئر کی طرح مجید امجد اور قرۃ العین حیدر اس خیال سے متفق ہیں کہ زندگی کی بساط پر جیت اور مات سے ہمکنار کرنے کا اختیار وقت ہی کو حاصل ہے۔

جب ضمیر محمد سعید نے رستم زماں گاما پہلوان کا آخری انٹرویو میو ہسپتال لاہور میں لیا تھا تب گاما پہلوان نے کہا تھا:

"موت اگر انسان کی صورت میں میرے ساتھ پنجہ آزمائی کرتی تو میں اسے چت کر دیتا۔"

یعنی رستم زماں گاما پہلوان نے وقت کو سب سے بڑی طاقت قرار دیا تھا یعنی وقت ہی ایک ایسی قوت ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

"یونان کے مشہور فلسفی ارسطو نے اپنی کتاب میں بتایا کہ ہومر، آرکیڈیا کے ساحل پر پھر رہا تھا، ماہی گیروں کی ایک بستی میں پہنچا تو اس نے ماہی گیروں سے ایک سوال کیا:

"اے آرکیڈیا کے ماہی گیرو تمہارے پاس کیا کچھ ہے؟"

اس کے جواب میں ایک ماہی گیر نے ایک پہیلی کہی کہ:

"جو کچھ ہم نے پکڑا تھا، وہ پیچھے چھوٹ گیا اور جو ہم نے نہیں پکڑا وہ ہمارے پاس ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ ہومر اس پہیلی کو نہ بوجھ سکا اور چند دن غور و فکر کے بعد اسی غم میں مر گیا۔" (۳)

Scanned by CamScanner

کا موضوع وقت کا وہ دھارا ہے جو انسان کی ارضی زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اس میں انسان نے خدا اور کائنات کو جس طرح سمجھا، خود اور غیر خود میں جس ہم آہنگی اور تطابق کی تلاش کی ہے، تہذیبوں اور سلطنتوں نے جس طرح اپنے جھنڈے گاڑے ہیں، انسانی رشتوں میں محبت و نفرت، ایثار اور خود پسندی، انانیت اور بیزاری، عقل و عشق کی آویزش نے جو پیچیدگیاں پیدا کی ہیں، تجربات کے بطن میں جو کرب اور تلخی چھپی ہوتی ہے اور اس سے مجموعی طور پر شخصیت کی نشوونما پر جو اثر پڑتا ہے، وہی سب کچھ اس ناول کا موضوع ہے۔

یوں ماضی بعید کے دور میں ہمیں شراوستی اور کپل وستو کے زمانے سے متعارف کرایا گیا ہے۔ تاریخ کی اس جھروکے میں بیٹھ کر ہم اولین دور کے باسیوں کے چہرے باآسانی پڑھ سکتے ہیں۔

ناول کے ابتدائی حصے میں ہم ڈھائی ہزار برس سے قبل کی فضا سے دوچار ہوتے ہیں۔ مظاہر فطرت سے ہم آہنگی، انسان اور خدا کے درمیان ربط و تعلق کے بارے میں اولین استفسار، عمل میں سادگی، ریاضت اور خلوص، کشادہ جبینی اور فروتنی انہی سے گوتم کی شخصیت کے نقوش آشکار ہوتے ہیں۔ گوتم جو اس ناول کا جیتا جاگتا کردار معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک مفکر کا ذہن، ایک فنکار کا وجدان اور ایک مخلص اور بے ریا انسان کا دل رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے اندرون میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہری شنکر، گوتم کے مقابلے میں حقیقت پسندانہ صلاحیت رکھتا ہے۔ چمپک، جو، بعد کی چمپا اور چمپا باجی کا نقش اول ہے، گوتم کی پرسکون کائنات میں تموج اور تلاطم پیدا کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔

یوں شراوستی سے چل کر جب ہم بنارس کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو گویا اسطوری عہد کو خیرباد کہہ کر تاریخ کے اجالے میں آجاتے ہیں۔ جہاں انسانی اعمال کے

Scanned by CamScanner

محرکات آسانی سے متعین اور شناخت کیے جاسکتے ہیں، اس لیے کہ اب انسانوں پہ ماورائی طاقتوں کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ اس معاشرے میں بڑی حد تک مرد کی بالادستی قائم اور تسلیم شدہ ہے اور عورت اس کی رضاجوئی پر مطمئن نظر آتی ہے۔ یہاں خارجی فطرت سے یگانگت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہاں انسان اپنے ماحول میں گھٹ کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ فطرت سے ہم کلام نظر آتا ہے۔ پھر جہاں شرادستی تھی اب اس کی جگہ بہرائچ نے لے لی ہے اور حسین شرقی کا عہد ہمارے پیش نظر آجاتا ہے۔ یوں ہم پوری طرح تاریخ کے اجالے میں آجاتے ہیں۔ یہاں درباری تکلفات، درباری سازشیں اور نئے عہد و پیمان سر اٹھانے لگتے ہیں۔

ابوالمنصور کمال الدین، جس کی رگوں میں اپنے اسلاف کا خون گردش کر رہا ہے اور قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے کمالات، اکتساب، اس کی چشم بصیرت پر عیاں ہیں۔ یہاں آکر وہ سماج کا نمائندہ اور بلیغ اشارہ بن جاتا ہے۔ وہ حسین شرقی کے کتب خانے کا نگران ہے۔ اس کی شخصیت کے ارتقاء میں دو چیزیں معاون ہیں، ہندو اور اسلامی فلسفے کا تصادم اور تعامل، فارسی شاعری اور محبت کے تصور میں تبدیلی اور دوسرے انسانی بے بسی اور لاچاری کا وہ گہرا تاثر جو پیہم جنگوں کے تجربے نے اس کے دل و دماغ پر قائم کیا ہے۔ لیکن روح اور دل کی کائنات کی ساری منزلیں طے کرنے کے بعد ابوالمنصور کمال الدین نے یہ اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے، ایسا سکون جس میں پر خطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش نہ ہو۔ لیکن حسین شرقی تہذیب پر تصنع اور بے جا سجاوٹ اور چمک دمک کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور یہاں کوئی ایسی اقدار، ضابطے اور نصب العین دستیاب نہیں ہیں جن کی پاسداری یا جن کے حصول کو حاصل زیست قرار دیا جاسکے۔ تناظر بدلنے کے ساتھ ہی ہم اور ہی تہذیب کی اخلاقی دھوپ سے متعارف کرائے جاتے ہیں۔ یہاں اس طرح کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ پہلے وہ لوگ جو زوال آمادہ بلکہ زوال یافتہ

Scanned by CamScanner

تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں اور دوسرے وہ طبقہ ہے جو جدید دور اور اس کے التزامات اور تجاذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس طبقے کے لوگ اپنی اپنی دلچسپیوں اور زندگی کی گوناگوں ترغیبات اور ان کے ارتقاشات میں مگن اور سرشار نظر آتے ہیں۔ ناول میں مشرقی پاکستان (ڈھاکہ) کے گرد و نواح کی جو نقش گری کی گئی ہے وہ بہت دلکش ہے۔

اس ناول میں بیانیہ کی قوت کا اعجاز بھی بہت سی جگہوں پر نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ اس ناول کا بیشتر حصہ اوپری درمیانی طبقے کی عکاسی کرتا ہے لیکن اس میں عوامی زندگی کے نقش و نگار بھی واضح طور سے سامنے آتے ہیں۔

ناول میں گوتم، ہری شنکر اور چمپک کے سلسلے میں ناول نگار کا لہجہ بے حد سنجیدہ ہی نہیں بلکہ زندگی کے تجربات کی تلخی سے گراں بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں تاریخی شعور اور تخلیقی فن کے آداب کو از حد خوب صورتی سے سمویا گیا ہے۔ ''آگ کا دریا'' کے بعد ''وقت'' کے حوالے سے عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' بھی زیر بحث آتا رہا ہے لیکن ''اداس نسلیں'' میں وہ تجریدیت نہیں۔ جیسا کہ ''آگ کا دریا'' میں ملتی ہے۔ اس کے برعکس یہاں انسانی خطوط صاف طور سے نمایاں ہیں۔ اس سے ناول میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اس ناول میں ہمیں انسانیت کا وہ نغمہ سنائی دیتا ہے جسے words worth نے "Still,sad music of humanity" کہہ کر ممیز کیا ہے اور جواں مرگ انگریز شاعر کیٹس نے "Agony of mankind" کا نام دیا ہے۔ اس ناول میں سماج کے مختلف طبقے بغیر کسی امتیاز کے اپنے اپنے رنج و الم، مسرتیں، محرومیاں، تعصبات اور فروگزاشتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ناول پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے اور تقسیم ہند کی پرآشوب اور ہنگامہ خیز مدت تک پھیلا ہوا ہے۔ ''آگ کا دریا'' کی طرح اس میں بھی وقت گزرنے کا احساس جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے اور یہ بھی کہ

Scanned by CamScanner

مثبت اور منفی قوتیں ایک دوسرے کے علی الرغم ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ یہ ناول ڈی۔ ایچ لارنس کے ناول "The Rainbow" کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں ہم دوران کی مختلف حد بندیوں اور کئی نسلوں کے نمائندوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان میں تاریخ کا تسلسل اتنا اہم نہیں جتنا ان نسلوں کے ذہن و قلب کی مختلف کیفیتوں کی مصوری، جو تاریخ کے راکب بھی ہیں اور مرکب بھی۔ ناول کے پہلے حصے میں کہا گیا ہے کہ انفرادی موت قابل برداشت ہوتی ہے لیکن اجتماعی موت، جس میں انسان حشرات الارض کی طرح روندے جاتے ہیں، بہت عبرتناک ہے۔ ناول کا ایک اہم پہلو یادوں کی وہ کائنات ہے جو بعض کرداروں کے لیے ایک وقیع سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت کے حوالے سے اس میں ماضی سے وابستگی اور اس کے لیے وہ کشش جسے ناسٹلجیا کا نام دیا گیا ہے، ملتی ہے۔ جب کہ ''آگ کا دریا'' کی طرح ''اداس نسلیں'' بھی وقت کے ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوتا ہے۔ حال کا وجود ایک سراب کی مانند ہے جو لحہ لحہ انسان کی گرفت سے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ ناول میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ بھی ہر طرح کے تکلف، احتیاط اور پیش بینی سے بے نیاز ہے۔ لیکن ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا یہ کہنا ہے کہ ''اداس نسلیں'' کی نثر حاصل محمد سلیم الرحمن کے قلم لگانے کا نتیجہ ہے اور یہ بات اس لیے بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ عبداللہ حسین کی اپنی بعد کی تحریروں میں اس طرح کی نثر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ''اداس نسلیں'' میں پنجاب کے دیہاتوں کی تصویریں بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، ساتھ تنکھوں کی عجیب و غریب نفسیات کے نمونے۔ اس ناول میں نہ صرف کرداروں کی فراوانی کا متحرک وجود ملتا ہے بلکہ فطری مظاہر کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ ناول میں مجموعی طور پر ایک متحرک اور نامیاتی زندگی کا تصور ابھرتا ہے اور جب ناول ختم ہو جاتا ہے تب بھی ایک گونج وسیع فضاؤں میں بگولے کی طرح پابجولاں سنائی دیتی ہے، جو شاید اب تک مقید رہی تھی۔

Scanned by CamScanner

اسی تسلسل میں اگر جمیلہ ہاشمی کے ناول ''دشتِ سوس'' کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے منصور بن حلاج کے کردار کی تاریخیت کو ایک لازوال تخلیق میں ڈھال دیا ہے اور اس کا انداز بیان یا قرینہ گفتگو تہلکہ خیزی کے ساتھ ساتھ قاری کے نس نس میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ناول کے پیش منظر میں سلطنت عثمانیہ کا دور ہے اور حسین جو ناول کا مرکزی کردار ہے ایک مضطرب اور سیماب آسا روح ہے جو ماورا سے بھی ماورا جانا چاہتا ہے اور وہ بھی صرف الہامات کی روشنی میں۔ یوں حسین بن منصور اور حامد بن عباس دو افسانوی متضاد کردار ہی نہیں بلکہ وہ خیر اور شر کی دو صورتیں ہیں۔ حسین کی انتہائے محدود، انتہائے عشق سے بغاوت اور شدید محبت کی غیر معمولی تجسیم ہے اور حامد بن عباس کی شدید نفرت اور ذات سے شدید محبت کی ایک معکوس شکل ہے۔

جہاں ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' تخلیقی نثر لکھنے کے حوالے سے اہم ہیں وہیں جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول غنائیہ المیہ ناول ہے۔ جس میں مرکزی کردار حسین بن منصور کا ہے جو ایک صوفی حلاج بن منصور کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس ناول کی بنیاد متضاد پر قائم ہے۔ ایک طرف بغداد اور دوسرے شہروں کی وہ زندگی جہاں انسان مادی ترقیوں کے حصول میں مصروف نظر آتا ہے اور دوسری طرف مختلف دینی مراکز ہیں، جہاں درس اور مجادلوں کی گرما گرمی ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی حسین کی ملاقات ایک نسطوری راہبہ انمول سے ہو جاتی ہے لیکن ان دونوں کے درمیان جو رشتہ عرفان و تفہیم تھا وہ ہر طرح کی نفسانی آلودگیوں سے پاک تھا اور ایک طرح کی ملکوتی شان اور تزئین رکھتا تھا لیکن حامد بن عباس، انمول سے نکاح کر لیتا ہے اور جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انمول تا زیست حسین کی محبت کی سحر میں گرفتار رہی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی اپنی زندگی ایک یخ بستہ خرابے میں محصور ہو کے رہ گئی ہے۔ اپنی کائنات کے یوں یک لخت مسمار ہونے پر اسے چاروں طرف گرد و بار کے طوفانوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ یوں، حامد بن عباس،

حسین بن منصور پہ ایک قہر کی صورت نازل ہوتا ہے اور جہاں تک فنا اور بقا کا تعلق ہے تو حسین بن منصور کے بیانات کے مطابق فنا ہی بقا کی کنجی فراہم کرتی ہے اور اس تصور کا سرچشمہ رسول اللہ کی اس حدیث قدسی میں ملتا ہے۔ (موتوا قبل انت موتو) "مرنے سے پہلے مر جاؤ" یوں حسین بن منصور کو شہید کرنے کی غرض سے جو فرد جرم مرتب کر دی گئی تھی۔ اس کی بنیاد دو امور پر تھی۔ اول، اس کا پرسوز، جاں گسل اور پیہم نعرہ انا الحق، دوسرے ارکان کی ظاہری بجا آوری کے ساتھ شریعت کی سخت گیری کو پوری طرح نہ تسلیم کرتے ہوئے اپنے رویائے صادق پہ یقین کامل اور بھرپور اعتماد اور نتیجۃً دنیوی معاملات، شان و شوکت اور تسلیم شدہ معیاروں کو استحقاق سے ٹھکرا دینا۔

یوں St Bonvantura کے الفاظ میں حسین بن منصور جائز طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا ایسا دائرہ ہے جس کا مرکز ہر طرف ہے اور جس کی بیرونی سطح کہیں بھی نہیں اور یہی تعریف شاید وقت کی بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ناول پس منظر و پیش منظر، مشمولہ "ناول اور داستان" سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۳

۲۔ اسلوب احمد انصاری "اردو کے پندرہ ناول" بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء،

۳۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: "کلاسیکی ادب" (لیکچرز) اورینٹ پبلشرز، لاہور، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ۱۲

Scanned by CamScanner